غلام گردش

گلزار کہانی

بڑے لوگ کس طرح کے ہوتے ہیں۔ عام انسان نظر آنے والے یہ محیر العقول بندے ہرگز ہرگز عام نہیں ہوتے۔ اولاد کی بہتری، مال و جائیداد کے حصول سے بالاتر ہو کر اپنے نکتہ نظر کے مطابق جدوجہد کرنا تمام عظیم آدمیوں کی یکساں خصوصیت ہے۔ یہ آسان منزل نہیں، لوگوں کی واضح اکثریت، اولاد کو برتر سے برتر مواقع دینا، رتبے کی خواہش رکھنا اور مالی آسودگی سے آگے بڑھ کر سوچنے سے قاصر ہے۔ مگر دنیا میں جس بھی انسان نے نمایاں کام کیا ہے، وہ ذاتیات سے اوپر نکل کر ہی کر پایا ہے۔ گلزار احمد مظاہری انہیں بڑے لوگوں کے قافلے کے مسافر ہیں۔ عرض کرتا چلو جماعت اسلامی سے طالب علم کا کوئی لینا دینا نہیں۔ مگر جب تعصب سے بالاتر ہو کر ملک میں سیاسی اور غیر سیاسی اکابرین کی طرف نگاہ دوڑاتا ہوں۔ تو اس جماعت میں بڑے بڑے تن آور درخت نظر آتے ہیں۔ یہ نہیں کہ دوسری سیاسی پارٹیاں، سرو کردار لوگوں سے بانجھ ہیں۔ ہرگز نہیں۔ مگر کردار کی پختہ محنت جتنی جماعت اسلامی میں کروائی جاتی ہے۔ وہ دوسری جگہ کم ملتی ہے۔ جب حسین احمد پراچہ نے اپنے والد محترم گلزار احمد مظاہری صاحب کے متعلق بتایا تو تجسس پیدا ہوا کہ کیا واقعی ایسے لوگ بھی اس ملک میں شاد رہے ہیں۔ حسین احمد صاحب نے کتاب بھیجی تو ایک نایاب شخص کو جاننے کا موقع ملا۔ ایک اور بات بھی عرض کرتا چلوں۔ جس محبت سے برادرم مجیب الرحمان شامی نے اس کتاب پر حاشیہ باندھا ہے۔ اس کے بعد کم از کم میرے جیسے طالب علم کے لئے الفاظ کا چناؤ حد درجہ مشکل ہو گیا ہے۔ گلزار کہانی کے نام سے یہ تبصرہ بذات خود ایک بڑے لکھاری کے نادر الفاظ ہیں۔

وہی مدعی وہی منصف میں درج ہے۔ 6 جنوری 1964ء کو حکومتی بلی نے سارے پاکستان میں کھبے نوچنے کا عملی مظاہرہ کیا۔ وطن عزیز میں سر اٹھا کر چلنے اور حکمرانوں کو اسلامی جمہوریہ پاکستان میں ان کے فرائض یاد دلانے کی پاداش میں جماعت اسلامی کو خلاف قانون قرار دیا گیا اور مشرقی و مغربی پاکستان سے جماعت کے 50 ارکان مجلس شوریٰ و عاملہ کو گرفتار کر لیا گیا۔ جماعت کے قائدین و عمائدین کو اچھی طرح معلوم ہے کہ جس جادۂ حق کے وہ مسافر ہیں اس میں اچانک ایک ایسا موڑ بھی آ جاتا ہے جو زندانوں اور قتل گاہوں کی طرف مڑتا ہے۔ قافلہ سخت جاں کے مسافروں کو اچھی طرح معلوم ہے کہ یہ وہی قافلہ ہے جس نے جابر حکمرانوں کے آگے کلمہ حق کہا ہے اور حق گوئی کی قیمت جاں پر کھیل کر ادا کی ہے۔ یہ لوگ اپنے آپ کو خوش نصیب سمجھتے ہیں کہ انہیں اس قافلے میں شامل ہونے کی سعادت حاصل ہوئی ہے۔

8 جنوری 1964ء بدھ (22 شعبان 1383 ہجری): آج بھی سارا دن بارش ہوتی رہی۔ قرآن پاک کا پہلا پارہ ترجمہ کے ساتھ ختم کیا ہے اور آج دوسرا پارہ شروع ہوا۔ حدیث مبارک کا مطالعہ بھی ہوا، نمازوں میں خوب لطف آ رہا ہے

آج ذکر بھی کیا۔نماز تہجد کی باقاعدگی جاری ہے قنوت نازلہ شروع کرنے کا ارادہ کیا جارہا ہے۔

خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے چند

اللہ کرے یہ بادل چھٹ جائیں، ظلم کی سیاہ رات ختم ہو جائے، ظلم کی تاریخ ہی یہ ہے کہ اسے بالآخر ختم ہونا ہے۔لیکن ہر ظالم یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کچھ نہیں ہوگا۔ میں ہمیشہ قائم رہوں گا۔ حالانکہ ہمیشہ قائم ذات صرف رب العالمین کی ہے۔آج اخبارات بھی ملے۔مطالعہ سے معلوم ہوا کہ ہمارے حق میں بھی اور حکومت کے حق میں بھی بیان بازی جاری ہے۔کچھ علماء و مشائخ کے بیانات ہیں کہ گرفتاریاں ٹھیک ہوئی ہیں۔مخدوم رحمت گیلانی ملتانی، ملک فتح محمد ٹوانہ سرگودھا نے حکومتی اقدام کا خیر مقدم کیا ہے۔

18 مئی 1964ء: آج رات کچھ بے چینی رہی۔ ہمارے پڑوس میں ہی پھانسی گھر ہے۔ جہاں آج رات چار بدنصیب مسلمانوں کو پھانسی چڑھنا تھا۔ان میں ایک وہ دلدار شاہ بھی شامل ہے جس نے کل بہت ہنگامہ کیا تھا۔تین دوسرے چھینہ قوم سے ہیں۔اڑھائی بجے شب انہیں نہلایا گیا۔ پھر پھانسی گھاٹ لے جایا گیا یہ خود چل کر اور نعرے مارتے ہوئے گئے۔سب نے بآواز بلند معافی مانگی۔سپرنٹنڈنٹ کو کہا ہمیں پکڑ کر پھٹہ نہ چڑھانا ہم خود چڑھ جائیں گے۔ہمارے گلے میں رسی کوئی سید ڈالے۔رسہ تو چمار نے ہی ڈالا البتہ رسے پر ہاتھ سید حسین شاہ کا پھروا دیا گیا۔شیخ صاحب نے کہا کلمہ شریف پڑھ لو اور زبان تالو سے لگالو۔پھر ہینڈل کھینچ دیا گیا اور وہ نیچے جا لگے۔

14 اگست 1964ء: عبدالصمد خان صاحب سے حدیث کی حجیت کے موضوع پر طے پایا کہ پہلے سوالات کی ایک فہرست بنائیں گے پھر اس کے مطابق گفتگو ہوگی۔ چنانچہ ان سے شق وار گفتگو ہوئی۔ جب گفتگو میں ان کے پاس کوئی دلیل نہ رہی تب کہنے لگے کہ ابن جوزی کے اصولوں پر پوری اترنے والی احادیث کو میں تسلیم کروں گا اور آپ حدیث کو قرآنی احکامات سے بالاتر نہ قرار دینے کا اعلانیہ اقرار کریں۔ چنانچہ انہوں نے اپنے قلم سے ایک تحریر لکھی اور اس پر اپنے دستخط کر دیئے اس طرح ان سے ایک موضوع اختتام پذیر ہوا۔

2 اکتوبر 1964ء: محترمہ فاطمہ جناح نے بیان دیا ہے کہ میں سوچ سمجھ کر میدان میں آئی ہوں اور آمریت کے خاتمے تک میدان میں رہوں گی۔ گورنر نے انتباہ کیا ہے کہ ذاتی حملے نہ کئے جائیں۔ ورنہ انجام ٹھیک نہیں ہوگا..... یہ حکمران اللہ سے نہیں ڈرتے حالانکہ ''ان بطش ربک لشدید'' تیرے رب کی پکڑ بڑی شدید ہے''۔ مشرقی پاکستان میں مکمل اور بھرپور ہڑتال ہوئی ہے۔کراچی میں چند طلبہ نے بیانات دیئے ہیں کہ ہم سیاست میں حصہ لیں گے۔ان کا کہنا ہے کہ جب قائداعظم کی زندگی میں نوجوانوں نے قومی سیاست میں بھرپور حصہ لیا تھا تو ہم آج بھی اپنا کردار ادا کریں گے۔

مادرملت کا پشاور کا جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ 75 ہزار افراد جلوس میں شریک ہوئے۔ 5 میل کے طویل راستے پر گامزن یہ ایک میل لمبا جلوس تھا۔

25 دسمبر 1964ء راولپنڈی: آج راولپنڈی کا جلسہ عام ہوا۔ 70-80 ہزار کی حاضری تھی۔ بہت بڑا جلسہ تھا۔ پہلی تقریر میری تھی۔ میں نے ان اشعار سے آغاز کیا:

اک نور بڑھا بڑھنے کے لئے
اک گرد جمی جم جانے کو
اک شمع جلی جلنے کے لئے
اک پھول کھلا مرجھانے کو

مادرلت کے انتخابی نشان لالٹین اور ایوب خان کے انتخابی نشان پھول کی وجہ سے ان اشعار نے مجمع میں جذبات کی آگ لگا دی۔ تالیوں پر تالیاں بجتی رہیں۔ تین چار دفعہ یہ اشعار سنے گئے۔

منقول ہے۔ مولانا گلزار احمد مظاہری کو جماعت اسلامی کے دوسرے قائدین کے مقابلے میں غالباً سب سے زیادہ عرصہ جیل کی کال کوٹھڑیوں اور زندانوں کی بلند و بالا فصیلوں کے پیچھے جانا پڑا۔ اس کا سبب یہ تھا کہ ایک تو والد صاحب کی ''باجماعت نظر بندی'' ہوتی۔ جب جماعت پر کسی فوجی یا ''جمہوری'' آمر کی طرف سے کوئی افتاد پڑتی تو والد گرامی بھی ''ہمہ یاراں دوزخ ہمہ یاراں بہشت'' میں پیش پیش ہوتے مگر اس کے علاوہ آئے روز انہیں اپنی شعلہ بیانی اور ''باغیانہ حق گوئی'' کی پاداش میں قید خانوں میں جانا پڑتا اور عدالتوں اور حکومتی دفتروں میں پیشیاں بھگتنا پڑتیں۔ والد صاحب اسے اپنی خوش قسمتی سمجھتے تھے کہ ان کی پہلی قید شیخ احمد سرہندی کی پیروی میں ہوئی۔ حضرت مجدد الف ثانی کو قلعہ گوالیار میں 17 ویں صدی کے اوائل میں نظر بند کیا گیا اور مولانا مظاہری کو 1953ء میں تحریک ختم نبوت کے زمانے میں شاہی قلعہ لاہور کے کسی تہہ خانے میں ڈال دیا گیا۔

مولانا مظاہری کے متعلق جہاں پروفیسر خورشید احمد اور خورشید رضوی جیسے اکابرین سب کچھ لکھ چکے ہوں، وہاں طالب علم کیا لکھ سکتا ہے۔ مگر مظاہری صاحب جیسے بامقصد لوگ کسی بھی سیاسی جماعت کی شان اور آن بان ہوتے ہیں۔ اس سطح کے بے غرض لوگ اب کم یاب ہو چکے ہیں یا شاید نایاب!